© rasailojaraid.com

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

دینی فکر میں اختلال اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ

دینی فکر میں اختلال کے اسباب اس کی نوعیت اور اس کے نتائج کو سمجھنے کے لئے اس کے تاریخی پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے۔

صدیوں تک قرآن مجید سے نظام تمدن کی خاطر قانون سازی کے لئے ہدایت طلب کرتے رہنے والا ذہن انقلاب سے دوچار ہو اور لاقانونیت کی حمایت میں اپنے خلاف طاقت کے استعمال کا مشاہدہ کرے تو مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے اور خدا پرستی کے دعوؤں اور تقوے اور طہارت کے تمام لوازمات کے باوجود خود اعتمادی سے محروم ہو کر مستقبل کی نسبت بے یقینی اور یاس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ہر شکست خوردہ طاقت دوبارہ ابھر سکتی ہے مگر ذہنی شکست خوردگی کے بعد اعتماد بحال نہیں رہ سکتا۔ جب تک ہمیں ۱۸۵۷ء کی جہاد آزادی میں شکست نہ ہوئی تھی ہمیں یہ اعتماد حاصل تھا کہ ہم غالب رہے تو خاطر خواہ اصلاح کر سکیں گے اس لئے ہم نے بہادر شاہ ظفر کو ان کے ضعف کے باوجود قائد انقلاب اور جنگِ آزادی کو جہاد اور اس میں مرنے کو شہادت تسلیم کیا تھا اور اس سے پہلے بھی یہ بصیرت رکھتے تھے مسلمانوں کو معاشی ابتلا میں ڈالنا بھی ان کے دین ہی کے خلاف جارحانہ اقدام ہے۔ اس لئے جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اناج کی ذخیرہ اندوزی شروع کی تو مولانا فضل حق خیر آبادی نے کمپنی کے خلاف فرضیت جہاد کا فتویٰ دیا تھا۔

مگر جب ہمیں جہاد آزادی میں شکست ہو گئی اور برطانوی استعمار ہمارے اوپر مسلط ہو گیا تو کئی تغیرات رونما ہوئے۔

- سیاسی تغیر سے برعظیم پر صدہا سال تک حکومت کرنے والے محکوم بنا دیئے گئے۔
- معاشی تغیر نے جاگیرداری نظام کی نوعیت بدل دی۔ مسلمانوں کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور غداروں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

• موقعہ پرستوں کو جاگیریں عطا کرنے کے بعد جاگیرداروں کو حقوق ملکیت تفویض کر دیئے گئے۔ اس کے نتیجے میں خواص و عام ایک جیسے معاشی ابتلاء کا شکار ہو گئے۔ لادینیت کے انداز میں اخلاق اور معیشت کے باہم دگر مربوط ہونے سے انکار کر دیا گیا اور (LASSAIZE - FAIRE) کے تحت اباحتی معیشت رائج کر دی گئی۔

و قانونی تغیر نے شرعی عدالتیں ختم کر دیں اور استعماری مفادات کے تحفظ کے لئے اسلامی قانون کو شخصی قانون (PERSONAL LAW) کی حیثیت دے دی گئی۔

و معاشرتی تغیر نے شریعت اسلام کے بجائے وطن پرستی کو عمرانی وحدت کے شعور کی اساس بنا دیا۔

و ایک معاند تہذیب کے غلبے سے اپنے ثقافتی فضائل کی برتری کا یقین ختم ہو گیا۔

و لادینی نظام تعلیم کے نفاذ سے دینی علوم کی تدریس کے بجائے لادینی علوم کی تدریس ہونے لگی۔

و دینی نظام تعلیم جسے ہمارے دور اقتدار میں آزاد تعلیم (LIBEREL EDUCATION) کی حیثیت حاصل تھی۔ کیونکہ اس میں طب، ہیئت و ہندسہ وغیرہ فنون داخل نصاب تھے۔ اس کا تعلق زندگی کے معاشرتی، معاشی، سیاسی، ثقافتی اور تعلیمی پہلوؤں سے منقطع ہو گیا اور وہ صرف عقائد کی تلقین اور عبادات کی ترغیب کے لئے مختص ہو کر رہ گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری زندگی لادینی (SECULAR) نظام کے تحت ڈھل گئی۔ خدا، رسول اور آخرت کا کوئی اثر اس معاشرے میں باقی نہ رہ سکا جس میں اسلام کے ارکان پنج گانہ کے ذریعہ یکسانی کردار پیدا کر کے عمرانی وحدت کا شعور فراہم کیا جا رہا تھا۔ یہ ارکان پنجگانہ اپنے معنی اور مقصود سے بے تعلق ہو کر رسوم و ظواہر کی حیثیت اختیار کر گئے۔

ضبطیٔ اوقاف کے قانون سے تمام دینی، تعلیمی، تبلیغی ادارے اور علماء مالی وسائل سے محروم ہو گئے اور اس کے بعد سے ادعائے اسلامیت کے باوجود ہماری حالت یہ ہے کہ صحیح قسم کی دینی قیادت اور دینی تربیت کے لئے ہمارے ذاتی بجٹ میں کوئی مد مختص نہیں رہ سکی۔

معاشرت، معیشت، سیاست، ثقافت اور تعلیم کے لادینی نظام کے تابع ہو جانے اور دینی نظام تعلیم کے معاشرت، معیشت، سیاست، ثقافت اور تعلیم سے بے دخل ہو جانے اور عقیدے، عبادات اور علوم دینیہ کا زندگی کے کسی پہلو سے تعلق [illegible] اور عبادات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رسوم و ظواہر میں تبدیل ہوگئیں۔

اب عقیدے کی حفاظت عمل سے نہیں ایسے استدلال سے کی جانے لگی جس کا زندگی پر کوئی اثر نہ تھا۔ ہر چند کہ از روئے قرآن عبادت اللہ تعالیٰ کا قرب و فضل طلب کرنے، اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے اور یقین حاصل کرنے اور تقویٰ پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ مگر رسوم و ظواہر میں تبدیل ہوجانے کے بعد مقصود بالذات متصور ہونے لگیں اور اس نقطۂ نظر سے وہی نفسیات بنی جو ذریعہ کو مقصود بنانے سے بنتی ہے یعنی جب ایک بخیل دولت کو زندگی کی آسائش کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے مقصود بالذات بنا لیتا ہے تو ہر آسائش سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عبادات کو مقصود بالذات بنایا تو استعانت باللہ کا بھی کوئی تصور باقی نہیں رہا اور تمام نتائج کو صرف آخرت پر ملتوی رکھنا اس لئے لازم آیا کہ اس زندگی میں زندگی کے سب تقاضے لادینی نظام ہی سے پورے ہو سکتے ہیں، اس لئے اس میں تقاضے پورے ہونے کی توقع صرف شیطان کی پیروی یعنی لادینی نظام سے وابستہ ہوگئی۔

زندگی کے غلط روی کے انداز پر ڈھل جانے کے بعد آخرت کا عقیدہ صرف عذابِ آخرت سے خوفزدہ کرنے کے ہتھیار کی صورت میں باقی رہ گیا۔ حالانکہ آخرت کی تمنا ہر انسان کے دل میں اس وجہ سے موجود ہے کہ نیکی کا بغیر اجر کے رائیگاں جانا، بدی کا مکافاتِ عمل کو پہنچنا اور ظلم کا بغیر دادرسی کے رہ جانا کسی انسان کو گوارا نہیں۔ صرف ظالم غاصب اور مفاد پرستوں کو آخرت کا انکار اس لئے کرنا لازم آتا ہے کہ اعمال کی بازپرس جواب دہی اور جزا و سزا کو تسلیم کریں تو اس زندگی کو بدلنا لازم آئے گا اور قرآن مجید بھی آخرت کا اقرار اس لئے کرانا چاہتا ہے کہ اس سے ہماری یہ زندگی تقوے سے مزین ہو۔ كَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ...... (تم کیوں کر صاحبِ تقویٰ ہو سکتے ہو اگر اس دن کا انکار کرو جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا)

خدا کا تصور ایک مردہ مابعد الطبیعیات کا مقولہ بن کر رہ گیا اور اس کے جواب میں شیطان کی حیثیت بھی ایک مابعد الطبیعی وجود کی ہوگئی تو صوفیائے کرام نے اسے پہلے ہی موحدِ اعظم کے مرتبۂ عالیہ پر سرفراز کر رکھا تھا اس لئے تمام نتائج کو صرف آخرت پر منحصر رکھنے والے اس زندگی میں خدا اور خدا والوں کے غلبے سے مایوس ہو کر لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ کے دعوے کی سچائی پر قانع اور لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ کے دعوے کی سچائی سے مایوس ہو کر صرف اپنی آخرت مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کو سونپنے پر مطمئن ہوگئے اور ہر چند کہ قرآن میں " [illegible] ہے ابلیسی طاقتوں کے مقابلہ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خدا کی قدرت سے مایوس ہو کر دشمنوں کے سیاسی اور معاشی اقتدار کے آگے سپر ڈالے ہوئے صرف وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ کہہ کر اپنے آپ کو ذمہ داری سے عہدہ برآ سمجھتے رہے حالانکہ پیغمبرانہ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ اور داعظانہ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ میں یہ فرق ہے ۔پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اس کی جماعت کو خلاف ورزی کرنے والوں کے انجام کا یقین ہے اور داعظانہ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ میں خلاف ورزی کے نتائج کے اعتبار سے بے یقینی اور مایوسی کے ہوتے ہوئے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے اظہار کے علاوہ کچھ نہیں ہے ۔

ایک عامیانہ ذہن کو توحید کی پسندیدگی اور شرک کی ناپسندیدگی کا یقین دلانے اور اندازہ کرانے کیلئے کہا جاتا رہا کہ خدا کو اپنا شریک ایسا ہی ناپسند ہے جیسے عورت کو اپنی سوکن ناپسند ہوتی ہے ، حالانکہ عورت کو سوکن کے ناپسند کرنے کی وجہ اس کا یہ ضعف ہے کہ سوکن کی وجہ سے شوہر کے التفاف سے محروم ہو جائے تو کوئی حیثیت باقی نہیں رہے گی ۔ اسی تمثیل پر خدا کے جلال ، یکتائی اور شان بے نیازی کو قیاس کرنے مطلب یہ ہے کہ گویا ہمارے شرکت کرنے سے خدائی کو کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے معاذ اللہ حالانکہ اسکی عظمت اور جلال کی شان تو یہ ہے کہ ہم کروڑ در کروڑ معبودوں کو اپنے سجدہ طاغوت میں شریک کر لیں تو بھی اس شان صمدیت میں ذرہ برابر کمی نہیں آسکتی ۔

شرک کا محرک صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری خواہش ہمارا معبود بن جائے جس کے اثر سے ہم حرص و لالچ میں مبتلا ہو کر نفع بخشی ، فیض رسانی اور نشو و نما کا راستہ روکتے ہیں اور توحید جس تزکیہ ، طہارت اور پاکیزگی کا مطالبہ ہم سے کرتی ہے وہ حرص و لالچ سے پاک ہوئے بغیر اور نفع بخشی اور فیض رسانی اور نشو و نما کا راستہ کھولے بغیر میسر نہیں آسکتی اور اس کے بغیر ہم فلاح نہیں پا سکتے ۔

موجودہ صورت حال کافرانہ یقین اور مومنانہ بے یقینی کی کش مکش کا مظہر ہے ۔خدا دشمن اور مفاد پرست گروہ اپنی تدبیر کار کے مؤثر ہونے کا یقین رکھتا ہے اور مذہبی ذہن کو اپنے طریق کار کی نتیجہ خیزی پر کوئی یقین نہیں ہے اور دونوں کا تجربہ ان کے اپنے اپنے طریق کار کے مؤثر ہونے کے یقین اور بے یقینی کی شہادت دے رہا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے لیے میدان عمل " عوام " ہیں اور عوام کی حالت یہ ہے کہ انہیں حضور قلب سے نفرت ہو گئی ہے ۔ وعظ ان کے لئے بے اثر ہو گیا ہے ۔ ان کی زندگی میں بدی اور بے ضمیری کے درمیان کوئی حدِ فاصل باقی نہیں رہ گئی ۔ وہ طرح طرح کی چالیں سوچتے ہیں اور مفاد پرستی کے نظام سے سازگاری کرنا چاہتے ہیں ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طلب زر میں دھوکہ کھانا ان کا شعار بن گیا ہے۔ معاشی، عمرانی اعتبار غیر محفوظ ہونے کا شدید احساس اُن کی اس نفسیات کا اصلی سبب ہے۔ علماء الا ماشاء اللہ خود بھی معاشی اعتبار سے غیر محفوظ ہیں مگر معیشت کو دین کا مسئلہ نہیں سمجھتے۔ اس لئے عوام کی سیرت کے اختلال سے بے نیاز رہ کر ان کی اصلاح محض واعظانہ شیوہ بیانی اور خطیبانہ شعلہ نوائی سے کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ اس سے کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہوتا اس لئے مذہبی ذہن کو اپنی تدبیر کار کے نتیجہ خیز ہونے کا یقین زائل ہوتا جاتا ہے اور بے یقینی غالب آتی جاتی ہے۔ بخلاف اس کے خدا دشمن اور مفاد پرست گروہ عوام کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں اور عوام اپنی حاجتمندی کے پیش نظر دھوکہ کھانا چاہتے ہیں۔ اس لئے نتیجہ وہی نکلتا ہے جس کی توقع کی جاتی ہے اور وہ اپنے طریقِ کار کے نتیجہ خیز ہونے کا اعتماد بحال کرتے جاتے ہیں۔

دینی فکر میں اختلال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مذہبی ذہن بدلنے والی اقدار کو نہ بدلنے والی اقدار منوانے پر مُصر ہے۔ اقدار دو قسم کی ہیں۔ ایک ہمیشہ سے کامل اور اس لئے ناقابلِ تغیر، جیسے اخلاق اور دین، دوسرے ارتقا پذیر۔ لہذا بدلنے والی اقدار جیسے علم اور معیشت، بدلنے والی اقدار کو اُن کے ارتقاء کے ہر مرحلے پر از سرِ نو اقدار کاملہ سے ہم آہنگ نہ کیا جائے تو فکر و عمل میں اختلال ہی پیدا ہوگا۔ چونکہ ہم اپنے تصوّرات کے بارے میں کوئی واضح ذہن نہیں رکھتے اس لئے نہ تو ہمارے عمل کی کوئی سمت مقرر ہوتی ہے نہ خاطر خواہ نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہماری اس معذوری کا سرچشمہ یہ ہے کہ ہم خدا، رسول اور قرآن کو مراسم پرستی کے زاویہ نگاہ تابع تصوّر کرکے جو رہنمائی قرآن سے حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ بے یقینی کے سوائے کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔

ڈیڑھ سو برس تک برطانوی شہنشاہیت کے تمام وسائل اسلام کے قابلِ عمل ہونے کی نسبت ہمارے اعتماد کو مٹانے اور ہمیں اسلام سے منحرف کرانے کے لئے استعمال کئے جاتے رہے۔ جب آزادی حاصل ہوئی تو دین، لادینیت کے تابع ہو جانے کی وجہ سے ادیان محرفہ کی تمثیل پر نجات اخروی کا ذریعہ بن چکا تھا۔ ہماری انفرادی سیرت میں یہ شگاف ڈالا جا چکا تھا کہ مذہب صرف زندگی کے انفرادی، نجی، ذاتی، شخصی، باطنی پہلو سے تعلق رکھتا ہے اور معاشرتی، معاشی، سیاسی، ثقافتی اور تعلیمی مسائل صرف لادینی (SECULAR) نظام سے پورے ہوتے ہیں۔

ہم نے اپنے دینی فکر میں اختلال کا تدارک کرنے کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا اور ضرورت یہ تھی کہ ہم اپنی حیات اجتماعی کے سرچشموں (کتاب، سنت اور تاریخ اسلام) سے ولولہ اخذ کرکے موثرات اختلال کا تدارک کریں اور اختلال انگیزی کے مؤثرات کے جواب میں قوم کی دل کی حفاظت کر سکیں مگر کتاب، سنت اور تاریخ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام کی نسبت ہمارے تصورات مسخ ہو چکے تھے۔ ہم نے اپنے دورِ زوال کے شکست خوردہ ذہن کے ساتھ کتاب و سنت اور تاریخ اسلام کے جو تصورات وضع کئے تھے ان میں حیات بخشی کی کوئی ضمانت باقی نہیں رہ گئی تھی مثلاً

۱۔ ہمارا ذہن غایت نزول قرآن کے باب میں التباس کا شکار ہو جاتا ہے۔

۲۔ سنت اور اسوۂ مبارک جو غایت بعثت کو پانے کی جدوجہد کا مظہر ہے۔ اس کی پیروی سے زیادہ ہمارے حق میں کوئی اور چیز مضر نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ہماری آرزو مقصود بعثت کو حاصل کرنے کے بجائے بین الاقوامی زندگی میں مسلمانوں سے اتحاد کے بجائے دشمنان اسلام سے سازگاری بن گئی تھی۔

۳۔ تاریخِ اسلام کی نسبت ہم نے یہ رائے قائم کی تھی کہ اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ اسلام سے اِبا، انحراف، انکار، سرکشی اور بغاوت کی تاریخ ہے کیونکہ خلافتِ راشدہ کے فوراً بعد سے (بقول ہمارے بعض خود ساختہ مصلحین امت کے) اسلام کی اجتماعیت کی زمام جاہلیت کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی ہے۔

غایت نزولِ قرآن کی نسبت ہمارا ذہنی التباس یہ ہے کہ اس کے بارے میں دو موقف اختیار کئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کے نازل ہونے کا مقصود صرف اخلاقی اصلاح ہے اور دوسرا یہ کہ قرآن مجید زندگی کے ہر پہلو میں ہدایت دینے کے لئے نازل ہوا ہے۔ پہلے موقف میں دشواری یہ ہے کہ اس کی رو سے مذہب کی اصلی حقیقت فضائل اخلاق بن جاتے ہیں اور دین ایک مستقل بالذات فضیلت کی حیثیت سے متصور نہیں رہتا اور توحید صرف فضائل اخلاق کے ذریعہ کی حیثیت سے باقی رہتی ہے مگر جب ہم عقلی بنیادوں پر غور کر کے اس نتیجے پر پہنچیں کہ اخلاق فرض کو فرض کی خاطر انجام دینے میں مضمر ہے تو توحید کی ضرورت ذریعہ کے طور پر بھی باقی نہیں رہتی۔ نیز یہ کہ قرآن مجید (معاذ اللہ) کتاب الہدیٰ کی حیثیت سے ناقص متصور ہوتا ہے کیونکہ زندگی کے باقی مسائل میں ہدایت کی احتیاج باقی رہ جاتی ہے جسے کسی اور ذریعہ سے پورا کرنا لازم آتا ہے۔

صرف یہی نہیں اگر مذہب کی اصلی حقیقت فضائلِ اخلاق رہ جائیں تو فضائل اخلاق پر اصرار اکثر مذاہب میں ملے گا اور سوال یہ پیدا ہوگا کہ دوسرے ادیان کے اتباع سے جو فضائل پیدا ہوں گے وہ قابلِ قبول ہوں گے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہو تو یہ خود پسندانہ بے انصافی ہوگی اور اگر جواب اثبات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہو تو........ پھر ان الدین عند اللہ الاسلام کے کیا معنی باقی رہ جائیں گے ؟

حقیقت یہ ہے نہ تو فضائل اخلاق مختلف ادیان میں مشترک ہیں اور نہ مذہب کی حقیقت اصلی اخلاق ہے۔ یہ ذہن تو خالص اسلام کی بنیاد پر جدوجہد کر کے نتائج پیدا کرنے کی نسبت مایوس ہو کر پیدا ہوا اور یہ موقف اختیار کرنا لازم آیا کہ ؎

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را
وقت است دگر بت کدہ سازند حرم را

دین کی حقیقتِ اصلی انسان اور خدا کے درمیان عبودیت کی نسبت اور اس نسبت کے تقاضے سے متعین ہونے والا طرز عمل ہے اور اخلاق مضمر ہے انسانی شخصیت کو (خواہ وہ فاعل اخلاق کی اپنی ذات میں ہو یا دوسروں کی) مقصود بالذات سمجھ کر اسکے تعلق میں اختیار کئے جانے والے طرز عمل میں اور فضائل اخلاق مذاہب میں مشترک نہیں ہو سکتے۔ اس کا اندازہ ہر مذہب کے نزدیک ام الفضائل یا راس الحسنات کے تصور کو سمجھنے سے ہوگا۔ یہودیت کے نزدیک سب سے بڑی نیکی "تشرع" ہے یعنی لفظِ قانون کی پیروی، خواہ وہ حیلہ ہی سے ہو اور مسیحیت کی رو سے سب سے بڑی نیکی "رحمدلی" ہے اور بدھ مت کی رد سے سب سے بڑی نیکی "ہمدردی" ہے اور ہندو مت کی رو سے "عجز و انکسار" سب سے بڑی نیکی ہے اور ان تمام نیکیوں پہ فریب مقدس (PIOUS FRAND) کے طور پر عمل ہو سکتا ہے، بخلاف ان تمام فضائل کے اسلام کے نزدیک خلوص سب سے بڑی نیکی ہے جسے خواہش اور فرض کے مابین کش مکش کے وقت اخلاقی حکم کی بجاآوری کی نیت میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

مگر ہم اپنے اخلاقی وعظ و نصیحت میں ابھی تک ارسطو کے معیار اخلاق سے دست بردار نہیں ہوئے۔ جس کی رو سے نیکی افراط اور تفریط کے درمیان اس نقطۂ اعتدال میں مضمر ہے جس کی نسبت ارسطو اور اس کی ذریت اب تک یہ بتانے سے قاصر ہے کہ وہ نقطۂ اعتدال کہاں واقع ہے اور یہ وہ معیار ہے جس کی رو سے کمی کر کے وہ بدی، نیکی بن سکتی ہے جو افراط سے پیدا ہوتی ہے اور وہ بدی جو تفریط سے پیدا ہوتی ہو بدی میں اضافہ کرنے سے نیکی بن سکتی ہے حالانکہ نیکی اور بدی میں نوعیت کا فرق ہے۔

غایت نزول قرآن کے باب میں ہمارا دوسرا موقف یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں ہدایت مہیا کرنے کے لئے نازل ہوا ہے اور یہ ہدایت فقہی رہنمائی کی حیثیت رکھتی ہے مگر یہ ہدایت تعبیر نصوص سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میسر آتی ہے اس لئے باوجود اس کے کہ تعبیر انسانی ذہن کی زائیدہ ہوگی۔ نص ہدایت نہیں تعبیرِ نص ہی ہدایت ہے اور تعبیر میں اختلاف اصولاً روا ہے۔ اس لئے فقہی اختلافات کا سرچشمہ بھی قرآن مجید ہی متصور ہوتا ہے۔ فقہی ہدایت کو دین اور تکمیل فقہ کو تکمیل دین سمجھنے والا ذہن یہ سمجھنا نہیں چاہتا کہ جب سے ہم بین الاقوامی سطح پر ان لوگوں کی طاقت کے سامنے مضمحل ہوئے ہیں جن کے پاس یہ دینِ کامل نہیں ہے۔ ہم اپنے ضعف کی تلافی کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ صدیوں سے قانون سازی کے لئے قرآن سے رہنمائی اخذ کرنے کا عادی ذہن قرآن سے طاقت اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے رہنمائی کی تمنا نہ کر سکا۔

ہمارا ذہن تکمیلِ دین اور ختمِ نبوت کے تصورات کی نسبت بھی الجھ گیا ہے۔

تکمیلِ دین سے مراد وہ ہدایت ہے جس میں نزولِ قرآن اور بعثت کی اس غایت کو پانے کی ضمانت ہے جو قرآن کے اس دعوے میں مضمر ہے۔

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ ولو کرہ المشرکون۔

اس تکمیل کو ہم اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اس آیہ پاک میں جو حجۃ الوداع کے دن نازل ہوئی تھی، جس روز ولو کرہ المشرکون کا چیلنج پورا ہو گیا تھا کہ کافروں کی مایوسی کا سبب کیا تھا؟

الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون ط الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

کافروں کی مایوسی کا سبب یہ تھا کہ اسلام غالب آگیا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اب اسلام مغلوب نہیں ہو سکتا اور ہم غالب نہیں آسکتے اور جس طریقِ کار سے ولو کرہ المشرکون کا چیلنج پورا ہوا تھا اس سے مشرف فرمانا تکمیلِ دین تھا۔

عقیدۂ ختمِ نبوت کے مضمرات یہ ہیں کہ نزولِ قرآن اور خاتم المرسلین کی بعثت کے بعد نوعِ انسانی نئی بعثت کی احتیاج سے بے نیاز ہو گئی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے نفوذ و اتباع سے تمام پسندیدہ نتائج غیر پیغمبرانہ قیادت کی رہنمائی میں پیدا ہو سکتے ہیں اور تاریخِ انسانی کے ہر زوال کا مداوا قرآن مجید کی عطا کردہ ہدایت سے ہو سکتا ہے۔

مگر ہم قرآن مجید کی رہنمائی کے نتیجہ خیز ہونے کے یقین سے اس لئے محروم ہیں کہ ہم سیرت سازی کی جدوجہد میں اُن شہداء [illegible] صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں صلابتِ کردار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیدا ہوئی تھی اور اپنی تن آسانی کے پیش نظر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تصدیق سے گریز کرتے ہیں جس کے جواب میں تکذیب پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کش مکش زندگی اور تصادم پر غالب آنے کی جدوجہد سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پہلے وعظ سے جو قریش کو جمع کرکے کوہ فاران سے دیا گیا تھا آج تک مسلمان عداوت وعناد اور جنگ سے دوچار ہیں اور قرآن مجید کی ہدایت کی نتیجہ خیزی اسی صورتحال پر منطبق کر آزمائی جاسکتی ہے۔ اس کش مکش اور تصادم سے گریز کرکے نہیں اور یہ تب ہی ممکن ہوگا کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزول قرآن کے مقصود کو پانے کی جدوجہد میں قرآن سے ہدایت چاہیں اور اس لئے ہمیں مانگی ہوئی اصطلاحات سے گریز کرکے قرآنی غایت کے لئے قرآنی طریق کار کے مطابق پہلے اپنے فکر کا رخ صحیح کرنے کے لئے اپنی اصطلاحات میں غور کریں۔

بحالات موجودہ جو چیز قرآن مجید سے ہدایت اخذ کرنے میں حائل ہوگئی ہے وہ ہمارے کچھ مغالطے ہیں۔ دین وایمان کو سہارا دینے کے لئے ہم صرف اپنی خواہش کو یقین سمجھتے ہیں اور انسانی ذرائع سے حاصل ہونے والے علم کو علم اور وحی کے مافوق البشری ذریعہ سے حاصل ہونے والے علم کو دین سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی علم ہی ہے اور دونوں قسم کے علم کی نسبت یقین ایک جدا حقیقت ہے۔ دین علم بالوحی کی روشنی میں بندے اور خدا کے درمیان عبودیت کی نسبت اور اس نسبت کی بناء پر پیدا ہونے والا عمل ہے جو زندگی کے ہر پہلو کو محیط ہے، اس عمل کا کمال اخلاص باللہ ہے۔

علم کا موضوع وجود ہے جو صرف ادراک حقیقت کا نام ہے اور عمل کا موضوع کمال ہے جو حصولِ مقصد سے وابستہ ہے۔ علم کا مسئلہ یہ ہے کہ وجود کیا ہے؟ اور عمل کا مسئلہ یہ ہے کہ کمال کیسے حاصل ہو۔ علم کا محرک موضوع کی نسبت شک ہے۔ عمل کا محرک مقصود کی نسبت یقین ہے ——— علم سے پہلے لاعلمی ہے اور عمل سے پہلے ایمان ہے کہ مقصود حاصل ہوگا ——— علم کا نتیجہ ادراک حقیقت ہے۔ عمل کا نتیجہ حصولِ مقصود ہے ——— علم کے لئے "جبر" ضروری ہے یعنی علت ومعلول کا تعلق اور عمل کیلئے اختیار ناگزیر ہے ——— تفسیر علم کے لئے ہے اور قرآن عمل کے لئے ——— تفسیری علوم کا موضوع قرآن ہے۔ علوم علوم ہی رہیں گے محرکِ عمل نہیں بن سکتے۔ قرآن کا موضوع غایتِ نزول کا حصول ہے۔

آج قرآن کا بدل تفسیر بن گئی ہے۔ تفسیر کی شانِ نزول یہ ہے کہ مفسر قرآن کو کیا دیکھنا چاہتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اسی لئے تفسیروں میں تنوع ہے اور قرآن کی شانِ نزول یہ ہے کہ قرآن انسان کو کیا دیکھنا چاہتا ہے۔ قرآن اللہ تعالیٰ کا عطا کیا ہوا علم ہے اور تفسیر انسانی شعور کے زائیدہ علوم پر مشتمل ہے۔ جب سے مسلمان بین الاقوامی سطح پر مضمحل ہوئے ہیں تو علومِ تفسیر مسلمانوں کی تقدیر کو بدلنے میں مؤثر ثابت نہیں ہو سکے۔ اور شکست و زوال کا ہر مرحلہ بے یقینی میں اضافہ کرتا رہا ہے، کیونکہ تقدیر نہ تو علم ترتیب سُوَر سے بدلی جا سکی نہ ناسخ و منسوخ کے جاننے سے نہ شانِ نزول کے جاننے سے نہ امثال القرآن کے حوالے سے نہ قصصِ قرآنی کی اسرائیلیاتی تفصیل سے، نہ حروف کی گنتی سے نہ اعراب کے شمار سے۔ تمام تفسیری علوم کی حیثیت تزئینی علوم کی ہے اور ان تمام علوم کی بے تاثیری نے ہمیں یہاں لا کر کھڑا کر دیا ہے کہ قرآنی ہدایت کے لفظ بہ لفظ محفوظ ہونے کے باوجود یہ اعتماد مضمحل ہو گیا ہے کہ یہ ہدایت نتیجہ خیز بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینی نظامِ تعلیم کی کسی درس گاہ میں قرآن مجید داخلِ نصاب نہیں ہے۔ تمام علوم جو بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن فہمی کا ذریعہ بن سکتے تھے وہ سب داخلِ نصاب ہیں، مگر نہیں پڑھایا جاتا تو قرآن مجید۔

تمام علوم اپنی اصطلاحات میں بند ہیں اور کسی علم سے اس کی اصطلاحات کو سمجھے بغیر استفادہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم قرآنی نقطۂ نظر سے اپنی زندگی میں انقلاب لانا چاہیں تو ہمیں قرآن کا مطالعہ نزولِ قرآن کے مقصد کی روشنی میں کر کے اس کی وکالت اس انداز سے کرنے کے بجائے جیسے ایک وکیل اپنے ملزم موکل کی وکالت کرتا ہے قرآن مجید کا وہ چیلنج پیشِ نظر رکھ کر جو وہ اپنے منکروں کو دے رہا ہے، قرآن مجید ہی سے ہمیں یہ جستجو کرنی پڑے گی کہ جن شرائط کے پورا ہونے پر قرآنی دعوؤں کے پورا ہونے کا انحصار ہے وہ کیسے پوری کرتا ہے۔ مثلاً قرآن ایسا معاشرہ پیدا کرنا چاہتا ہو جو نوعِ انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو۔ (یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفسٍ واحدۃ) جو اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو۔ (کنتم خیر امۃٍ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تومنون باللہ) تو قرآن ہی سے یہ طے کرنا ہوگا کہ افراد کا اخلاقی جدوجہد کرنے والا اور روحانی الذہن ہونا کیوں ضروری ہے اور وہ اس نمونے پر کیونکر ڈھل سکیں گے؟ اور اگر افراد اور معاشرے کا خوف و غم سے محفوظ ہونا ضروری ہو (فاما یاتینکم منی ھدیً فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون) تو وہ کون سی ہدایت ہے جس کی بدولت خوف و حزن سے محفوظ رہنا یقینی ہے؟ اور خوف و غم کی تفصیل کیا ہیں اور ان کا علاج کیا ہے؟ اور اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جدوجہد کے لئے جو یقین ضروری ہے اس کی اساس کیا ہوگی کہ وہ یقین شک وشبہ سے بالاتر ہو اور قرآن مجید کا کِتٰبُ الھدیٰ ہونا باور آسکے ؟ اور اگر ایسے معاشرے کے ذریعہ بین الاقوامی زندگی میں دین حق کو غالب رکھنے میں اس معاشرے کے استمرار کی ضمانت ہو تو کیا لائحہ عمل ہوگا جس سے مطلوبہ نتائج پیدا ہو کر رہیں۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے غلبۂ حق کی آرزو اور غلبۂ باطل کا مشاہدہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ ہم غلبہ دین حق کے لیے قرآن مجید سے رہنمائی کی بھیک مانگنے کے بجائے تمدنی نظام کے لئے قانون سازی کی رہنمائی طلب کرتے رہے ہیں اور وہ بھی اس نظام تمدن اور قانون سازی کے لئے جس کے محفوظ رکھنے کی طاقت ہم میں اس لئے باقی نہیں رہی کہ جن شرائط سے غلبے کا حاصل ہونا مشروط تھا ان کو ہم اپنی بے بصیرتی کی بناء پر قرآن سے طلب نہیں کرسکے۔ قرآنی ہدایت کی نتیجہ خیزی سے مایوس ہو جانا ایمان کی نہیں کفر ونفاق کی علامت ہے۔

یہ بات دیانت کے خلاف ہوگی کہ میں اپنا یہ احساس چھپا کر رکھوں کہ "نشاۃ ثانیہ" کی اصطلاح تاریخ میں یونان کی وثنی تہذیب کے احیاء کے لئے استعمال ہوتی تھی اور "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" مستشرقین کی اصطلاح ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے منکر ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کو ایک سمجھتے ہیں اور سقوطِ بغداد سے گمان کرتے ہیں کہ اسلام کی موت واقع ہوگئی تھی —— ہم اپنی کسی جدوجہد کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا اور احیائے اسلام کا نام دیں تو پہلے اسلام کو مردہ اور ختم شدہ قوت سمجھنا لازم آئے گا پھر اپنی مسیحائی سے اس مردہ میں جان ڈالنے کا ادعا ہوگا۔ ہم اپنے فکر کا رخ صحیح رکھیں تو ہمیں اس حقیقت پر اپنا ذہن صاف کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کے زوال کے بعد ہر بار اسلام ہی نے مسلمانوں کو حیاتِ نوبخشی ہے نہ کہ مسلمانوں نے اسلام کو۔

© rasailojaraid.com